سر سید احمد خان کا تعلیمی نظام: ایک تنقیدی جائزہ

The Educational System of Sir Sayyed, A Critical Study.

ڈاکٹر ثوبیہ طاہر
شعبہ فلسفہ و بین المضامین مطالعہ جات، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور

ABSTRACT

This article intends to evaluate the education system introduced by the great Muslim reformer Syed Ahmad Khan who is better known as Sir Syed. His name immediately brings to mind Mohammadan Anglo Oriental College and Alighar Muslim University. He was the first person in ۱۹th century India who paid unmatched attention towards education of the Muslim populace. He had to face severe criticism and strong resistance from the religious circles but he remained committed and dedicated. As far as his services for the Muslim education in India are concerned; no one can deny them. However, there is another side of the picture too, which is considerably dark. There were some inherent flaws and drawbacks in the system of the great man. These defects not only proved detrimental to Muslims in United India but also adversely affected the educational system in Pakistan. We are still struggling with these issues after ۷۵ years of independence. What are these shortcomings which we inherited, and, how have they destroyed our education and psyche, have been covered in this paper.

کلیدی الفاظ: انگریزی، مسلم سماج، احساس محرومی، تعلیمی پسماندگی، علی گڑھ تحریک، طبقاتی نظامِ تعلیم، کوٹا سسٹم (Qauta System)، جداگانہ شناخت وغیرہ۔

۱۸۱۳ء کے چارٹر ایکٹ کے تحت ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستانی عوام کی تعلیمی ذمہ داری اپنے پاس رکھی۔ اس مقصد کے لیے سالانہ میزانیے میں تمام تر اخراجات کے بعد ایک لاکھ روپے کی رقم مختص کی گئی تاکہ ہندوستانی عوام کو سائنسی علوم سے بہرہ ور کیا جاسکے۔(۱)

چنانچہ ایکٹ ۱۸۱۳ء کی رو سے عیسائی مشنریوں کو برطانوی طرز پر سکول کھلونے کی اجازت مل گئی تاہم کمپنی نے فی الوقت مروجہ مشرقی تعلیمی ماڈل کو جاری رکھا۔ اصل مسئلہ اس وقت پیدا ہوا جب ایک لاکھ روپیہ اس مقصد کے لیے کم پڑ گیا اور اس سے عہدہ برا ہونے کے لیے مقامی سکولوں کو فوقیت دی گئی۔

بہت سے لوگوں نے اس امر کی مخالفت بھی کی کیونکہ وہ فوری طور پر ہندوستانی مدارس کی کایا کلپ چاہتے تھے اور ان کے نزدیک ذریعہ تعلیم انگریزی اور نصاب مغربی ہونا چاہیے تھا۔ تاہم یہ مخالفت خاطر خواہ اثر نہ دکھا سکی۔ جس کا اندازہ بومین۔ برام رپورٹ سے ہوتا ہے جس میں کورٹ آف ڈائریکٹرز ۱۸۱۴ کے فیصلے کا ذکر ہے۔

> "کورٹ آف ڈائریکٹرز نے مشرقی طریقہ تعلیم کی حوصلہ افزائی کی۔ کورٹ کے ارکان کا خیال تھا کہ یورپ کے سائنسی علم کو سنسکرت کے مقابلے میں کبھی بعد میں متعارف کروایا جائے"۔(۲)

تاہم بہت سے ہندو اداروں نے اپنے طور پر انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنالیا۔ ہندو کالج کلکتہ اس کی نمایاں مثال ہے۔ جس نے ۱۸۱۷ء میں مغربی تعلیم کا اجرا کیا اور انگریزی کو بطور زریعہ تعلیم اپنایا۔

دریں اثنا بنگال کے گورنر جنرل لارڈ ولیم بیٹنک (Lord Willan Beatinek) نے ۱۸۲۹ء میں جنرل کمیٹی آف پبلک انسٹرکشنز کو خط لکھا جس میں ایک مرتبہ پھر انگریزی کو ہندوستان کی انتظامی زبان بنانے کی سفارش کی گئی تھی۔ اور لارڈ ولیم بیٹنک نے میکالے (Macaulay) کو قانونی رائے کے لیے طلب کیا۔ میکالے نے ۱۸۳۵ میں انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنانے کی سفارش کی جسے سرکاری طور پر تسلیم کر کے انگریزی کو فی الفور درباری زبان کا درجہ دے دیا گیا۔ میکالے نے مندرجہ ذیل نکات اپنے نکتہ نظر کے جواز کے طور پر پیش کیے۔

۱۔ انگریزی جدید علوم کی کنجی ہے۔ چنانچہ یہ عربی اور سنسکرت سے زیادہ بامقصد ہے۔

۲۔ اس کا رتبہ دیگر مغربی زبانوں میں بھی ممتاز ہے۔ چونکہ ہندوستان میں حکمران طبقہ انگریزی زبان بولتا ہے۔ اس لیے اس کا قوی امکان ہے یہ جلد ہی مشرق میں بھی (اہم ترین) تجارتی زبان بن جائے گی۔

۳۔ یہ ہندوستان میں احیائے علوم کا باعث بھی بن سکتی ہے۔ جیسے کہ لاطینی اور یونانی انگلستان میں نشاۃ ثانیہ کا سبب بنیں۔

۴۔ ہندوستان کے مقامی باشندے بھی انگریزی سیکھنا چاہتے ہیں۔ صرف ان کی ایک مختصر تعداد مقامی زبانوں کے حق میں ہے۔ یہ خواہش بھی مصنوعی اور نقلی ہے۔ جسے صرف لالچ سے برقرار رکھا گیا ہے۔

۵۔ ہندوستان کے مقامی باشندے انگریزی زبان کے اچھے عالم بن سکتے ہیں جس کے لیے ہمیں خصوصی کاوش کرنا ہوگی۔

۶۔ تمام ہندوستانیوں کو انگریزی پڑھانا اگرچہ ممکن نہیں، البتہ یہ ضرور ممکن ہے کہ انگریزی تعلیم کے ذریعے ''ایک ایسا طبقہ وجود میں لایا جائے جو رنگ و نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر ذوق، رائے، اخلاق اور ذہن میں انگریز ہو'' اور انگریزی تعلیم انہیں عوام الناس سے جداگانہ بنادے۔ (۳)

میکالے کا آخری نکتہ سر سید احمد خان کے محمڈن اینگلو۔ اورینٹل کالج کے قیام کا سبب بنا جس کے باعث طبقاتی تعلیم آج بھی پاکستان کا مقدر ہے۔

میکالے کے اس بیان کے بعد انگریزی تعلیم کا بول بالا ہوا اور تمام وسائل اسی پر صرف کیے گئے۔ علوم مشرق کے لیے مختص تمام رقم روک دی گئی۔ یوں ہندوستان میں انگریزی اور مغربی علوم کا نیا دور شروع ہوا۔ ۱۸۴۴ء میں گورنر جنرل ہارڈنگ (Hardinge) نے اعلان کیا کہ سرکاری ملازمتوں میں انگریزی تعلیم یافتہ افراد کو ترجیح دی جائے گی اور چھوٹی ملازمتوں کے لیے بھی یہی پالیسی ہوگی۔ اس فیصلے نے ہندوستان کے اقتصادی منظر نامے کو بدل دیا۔ تعلیم یافتہ سرکاری ملازموں پر مشتمل ایک نیا متوسط طبقہ وجود میں آیا اور انگریزوں نے تعلیمی وظائف، تعلیمی گرانٹس اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کی بنیاد رکھی۔ اور اس طرح کلکتہ اور بمبئی میں یونیورسٹیاں وجود میں آئیں۔ تاہم اس تمام عمل نے سرکاری تعلیم سے مذہب کا عمل دخل مکمل طور پر ختم کر دیا۔ جس سے ہندوسان کی مقامی تعلیم کی بنیادیں ہل گئیں کیونکہ مذہبی تعلیم مقامی نظام کا سب سے بڑا نصب العین تھی۔ (۴)

یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ہندوستانیوں کی تعلیم کے فیصلے میں کوئی ہندوستانی شریک نہ تھا۔ مذکورہ بالا تمام معاملات سے مسلمان بری طرح متاثر ہوئے کیونکہ وہ خود کو مشنری اور سیکولر تمام اداروں کے لیے غیر موزوں پاتے تھے۔ تاہم ہندو نہ صرف اس تعلیمی نظام سے مستفید ہوئے بلکہ آگے چل کر ایک مضبوط تعلیم یافتہ مڈل کلاس ثابت ہوئے۔ مسلمانوں کی حالت زار پر سر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر (W.W. Hanter) نے ۱۸۷۷ میں ایک کتاب ''انڈین مسلمان'' کے عنوان سے لکھی جو لندن سے شائع ہوئی۔ اس میں انہوں نے بے حد دیانتدارانہ رائے دیتے ہوئے کہا۔

''لہٰذا اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں ہونی چاہیے کہ مسلمان ایسے نظام سے دور رہیں جس میں ان کی پسند و ناپسند کی کوئی جگہ نہ ہو، ان کی ضروریات کا کوئی خیال نہ رکھا گیا ہو، بلکہ اس کے برعکس جو ان کے مفادات کے خلاف اور ان کی سماجی روایات سے یکسر متضاد ہو۔ (۵)

۱۹۷۳ء کا مستقل بندوبست ایکٹ(Permant Settlement Act)بنگال کے مسلمانوں کی اقتصادی حالت کی مکمل تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ یہ ٹیکسوں اور محصولات سے متعلق تھا جس سے ہندو آبادی کو اعلیٰ ملازمتوں تک پہنچنے کے مواقع تھے۔ ہنٹر نے اس کے متعلق لکھا ہے۔

> ’’اس ایکٹ نے اُن ہندو کو لیکٹروں (ٹیکس وصول اہلکاروں) کو بہت فائدہ پہنچایا جو اس وقت تک غیر اہم عہدوں پر کام کرتے تھے۔ وہ ایکا ایکی اس کی مدد سے زمیندار بن گئے انہیں زیر کاشت رقبوں کے ماہانہ حقوق مل گئے اور انہوں نے وہ سب کچھ حاصل کر لیا جو مسلم دور حکمرانی میں صرف مسلمانوں کو مل سکتا تھا۔‘‘(۶)

قصہ مختصر کہ ۱۸۳۹ء تک مسلمانوں کو معاشی معاملات میں کچھ نہ کچھ حصہ حاصل رہا لیکن ۱۸۵۱ء تک پاسہ مکمل طور پر پلٹ پلٹ چکا تھا اور مسلمان اپنے تعلیمی و اقتصادی انحطاط کی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ (۷) یہ تھا وہ مختصر پس منظر جس نے سرسید احمد خاں کو پہلے ایک قوم پرست اور پھر ایک ماہر تعلیم میں تبدیل کر دیا۔ اُن کی کایا کلپ کا ابتدائی دور قوم پرستی کا تھا جس میں ہانس کوہن(Hans Kohan) کے زیرِ اثر تھے۔ کوہن کے الفاظ میں قوم پرستی ذہن اور شعور کا سب سے پہلا عمل ہے۔ (۸)

اُن کے نزدیک مکاتب یا مدارس بنانے کا اس وقت تک کوئی فائدہ نہ تھا جب تک آپ اپنی قوم کو مشکلات سے نکالنے کا عزم نہ رکھتے ہوں، ان کے مطابق: ’’کوئی عبادت، کوئی خیرات کوئی بھی نیک عمل اپنی قوم سے محبت سے بڑھ کر نہیں۔‘‘(۹)

۱۸۶۷ء میں سرسید نے ایک قومی اور جدید یونیورسٹی کا منصوبہ تیار کیا اور اسی برس یکم اگست کو برٹس انڈین ایسوی ایشن نے ایک عرضداشت حکومت کو پیش کی۔ اس عرضداشت میں شمالی ہند میں ایک ایسی یونیورسٹی کے قیام کی تجویز پیش کی گئی تھی جس میں جدید سائنسی علوم اردو میں پڑھائے جاسکیں۔ ان میں سے ایک تجویز یہ بھی تھی کہ کلکتہ یونیورسٹی کے ساتھ ایک ایسے شعبے کا الحاق کیا جائے جو مقامی زبان (زبانوں) میں تعلیم دے سکے۔ تاہم سرسید کی یہ تجویز کوئی پذیرائی حاصل نہ کر سکی۔ اور ۵ ستمبر ۱۸۶۷ کو گورنمنٹ آف انڈیا کے سیکرٹری بارے نے مقامی زبانوں اور انگریزی کا فرق واضح کیا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اردو جدید مغربی اور سائنسی علوم کے لیے مناسب نہیں کیونکہ اس میں کتب دستیاب نہیں۔ اعلیٰ علما کے لیے انگریزی بہتر زبان ہے۔ (۱۰)

شمالی ہند میں یونیورسٹی کے قیام کی تجویز بھی مسترد کر دی گئی۔ اب سرسید کے پاس انگریزی کو اپنانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ انگریزی کے حق میں سرسید نے مندرجہ ذیل دلائل دیے:

i۔ ہندوستانی انگریزی سیکھے بغیر سرکاری ملازمتیں حاصل نہیں کر سکتے۔

ii۔ اس کے بغیر جدید تجارت اور بین الاقوامی صنعت و حرفت میں حصہ لینا ممکن نہیں۔

iii۔ انگریزی کے علم کے بغیر عالمی سیاست کے اتار چڑھاؤ پر نظر رکھنا ناممکن تھا۔

iv۔ انگریزی پر عبور کے بغیر ہندوستانی عوام اپنے ہی سیاسی امور میں حصہ نہیں لے سکتے خواہ حکومتِ برطانیہ انہیں فراخدلی سے شریک کرنے پر تیار ہی کیوں نہ ہو۔(۱۱)

سرسید کے یہ اعتراضات علی گڑھ تحریک کا نقطہ آغاز تھے۔ اس مقصد کے لئے سرسید ۱۸۶۹ء میں خود انگلستان گئے تا کہ وہاں کے نظام تعلیم کا تفصیلی مطالعہ و مشاہدہ کر سکیں۔ وہ کیمبرج کے طریقہ تعلیم اور رہائشی انتظام سے بہت متاثر ہوئے اور اسی کو بعد ازاں انہوں نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میں پیش کیا۔ یہ کالج علی گڑھ میں قائم کیا گیا۔

اسی تفصیلی پس منظر کے بعد ہم اس قابل ہیں کہ سرسید کے نظام تعلیم، ان کے نصب العین، مقاصد اسکے فوائد اور نقصانات کا گہرائی سے جائزہ لے سکیں۔ تاہم یہ کہنے میں کوئی امر مانع نہیں کہ سرسید کی تعلیمی بصیرت علم کے عملی پہلو، نالج اور منفعت تک محدود رہی۔ انہیں عملیت پسند ماہر تعلیم کہنا ہرگز غلط نہ ہو گا۔ ابتداً سرسید روایتی تعلیم کے فروغ پر یقین رکھتے تھے کیونکہ ان کے خیال میں مساوات پر مبنی روایتی تعلیم عوام الناس میں ترقی کا سبب بنتی ہے۔ تاہم ۱۸۷۰ء کے بعد سرسید نے اپنے اس نظریے میں انقلابی تبدیلی کی اور روایتی اقدار کو جدید اقدار سے بدل لیا۔ یہیں سے ان کا کی اپنے مخالفین سے تصادم کا آغاز ہوا۔ ان کے ناقدین انہیں پہلے ہی تقسیم شدہ مسلم معاشرے میں مزید انتشار اور خلفشار کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔

یاد رہے کہ روایتی تعلیم کے لے سرسید نے مراد آباد پنچایتی مدرسہ قائم کیا تھا۔ جس کا قیام ۵ نومبر ۱۸۵۹ء کو عمل میں آیا۔ صرف ایک سال میں اس کے طلباء کی تعداد ۱۷۵ ہو گئی جن میں ۱۰۳ مسلمان اور ۷۲ ہندو تھے۔ یہاں ذریعہ تعلیم اردو اور فارسی تھا۔ ان دنوں سرسید مساوات کے قائل تھے۔ اور انہوں نے زمینداروں کو بھی آمادہ کیا کہ وہ اپنے بچے اس عوامی مدرسے میں بھیجیں۔ انہوں نے اس ضمن میں ہندو پاٹھ شالاؤں کی مثال بھی دی۔ ان کے مطابق اس دور کے متعدد نامور پنڈتوں اور جدی علمائے اسلام نے ابتدائی تعلیم سرکاری اور عوامی مدارس سے حاصل کی۔ ان کے نزدیک گھر تعلیم کے لیے مناسب نہیں تھے۔(۱۲)

بعد ازاں یہ پنچایتی مدرسہ گورنمنٹ ہائی سکول مراد آباد میں ضم ہو گیا۔ ۱۸۶۴ء میں انہوں ے غازی پور میں وکٹوریہ ہائی سکول کے نام سے ایک انگریزی سکول قائم کیا اس مقصد کے لیے مخیر ہندوؤں اور مسلمانوں نے ۸۰،۰۰۰ روپے کی امداد دی جس سے سکول کی عمارت تعمیر کرنے کے علاوہ اساتذہ کی تنخواہوں کا انتظام کیا گیا۔ حکومت سے کوئی مالی معاونت طلب نہیں کی گئی۔ اس اثنا میں سرسید نے اپنے فلسفہ تعلیم پر مزید نظر ثانی کی اور ۳۱ اگست ۱۸۶۹ء کو سیکرٹری آف سٹیٹ انڈیا کو ایک مرتبہ پھر ایک عرضداشت پیش کی جس میں ہندوستان میں جاری طریقہ تعلیم پر سخت تنقید کرتے ہوئے اسے بدل کر ترقی پسند نظام تعلیم رائج کرنے کی

سفارش کی گئی تھی۔ انہوں نے اپنا طریقہ تعلیم پیش کیا جس میں تین درجات یا طبقات تھے۔ سر سید کا تعلیمی ڈھانچہ ذیل میں دی گئی شکل میں پیش کیا گیا تھا۔

۱۔ مراعات یافتہ دانشور۔(تخلیقی عالم اساتذہ) (۱۳)

۲۔ پیشہ ور ماہرین، انتظامی عہدیدار، ناظم

۳۔ خواندہ محنت کش

انہوں نے برطانوی نظام تعلیم کو کڑی تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا کہ اس میں دانشور اور سکالر پیدا کرنے کی اہلیت نہیں ہے۔ بلکہ یہ محض کلرک، عرضی نویس اور ریلوے ٹکٹ کلکٹر پیدا کر رہا ہے۔ اس سے محض مٹھی بھر افراد ترقی کر کے متوسط اور بالائی طبقے تک پہنچ پاتے ہیں۔ برطانوی حکومت نے سر سید کی معروضات پر غور کرنے کی قطعاً کوئی زحمت نہیں کی جس پر بالآخر سر سید نے مسلمانوں کی تعلیم کے لیے اپنی پالیسیوں ہی کو بہتر جانا۔ یورپ سے واپسی پر انہوں نے اپنے فلسفہ تعلیم کی نوک پلک سنواری اور اسے حتمی شکل دی۔ ۱۸۷۲میں انہوں نے سماجی نظام پر اپنا جائزہ اور طبقاتی ڈھانچے پر مبنی نظام تعلیم تہذیب الاخلاق میں شائع کیا۔

سر سید نے ہندوستانی معاشرے کا گہرا مشاہدہ کر رکھا تھا جو ہزار ہا برس سے طبقات در طبقات میں تقسیم تھا چنانچہ ان کی تعلیمی سوچ بھی اسی طرح مدارج اور سلسلوں پر مشتمل تھی جس میں مختلف طبقے اپنا اپنا مخصوص کردار ادا کر سکتے تھے۔ اس نکتے کو ایک مشین کی طرح سے سمجھا جا سکتا ہے ایک مشین میں بھی ہر پرزہ اپنی اپنی جگہ پر اپنا اپنا تفویض کردہ کام کرتا ہے۔ اور یوں مشین درست طور پر فعال رہتی ہے۔ سر سید اپنے مجوزہ تعلیمی نظام سے پیچھے ہٹ گئے جو عوامی تعلیم اور مساوات پر مبنی تھا کیونکہ ان کے خیال میں ذات پات، برادریوں، مذاہب، فرقوں اور طبقوں میں تقسیم ہندوستانی معاشرہ اسے قبول کرنے کے قابل نہ تھا۔ یہ ابتدائی خیالات انہوں نے ۱۸۵۹ء میں پیش کیے تھے۔ جب مراد آباد پنچایتی مدرسہ قائم کیا گیا تھا انگلستان کا دورہ ان کے خیالات میں تبدیلی کے لیے فیصلہ کن ثابت ہوا۔ انگریز معاشرہ بھی مراعات یافتہ اور محنت کش طبقوں میں بٹا ہوا تھا۔ ہندوستان کی طرح وہاں بھی امراہی امورِ مملکت میں بااثر تھے۔ سر سید نے ہندوستان کی اشرافیہ کو مزید پانچ درجات میں بانٹ دیا۔

۱۔ وہ جو سرکار میں اعلیٰ عہدوں کے متمنی ہیں۔

۲۔ وہ جو صنعت و تجارت میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔

۳۔ وہ جو مشترکہ طور پر ذاتی جائیداد یا زمینوں کے لین دین اور زرعی اراضی کے انتظام میں زیادہ مہارت رکھتے ہیں۔

۴۔ وہ جو علوم وفنون کے شائق ہیں۔

۵۔وہ جنہیں مذہبی علوم پر دسترس کی خواہش ہے اور جو اپنے بچوں کو تعلیم دلوانا چاہتے ہیں برطانوی ماڈل کو سامنے رکھتے ہوئے انہوں نے ہندوستان کے لیے بھی یہی طریقہ تعلیم تجویز کیا جو ایسے افراد پیدا کرے جو معاشرے میں مختلف خدمات انجام دے سکیں۔ سرسید اب ایک ایسے نظام تعلیم میں یقین رکھتے تھے جو مثالی اور حقیقی، فطری اور عملی کی ثنویت میں منقسم تھا۔ وہ اسے ایک حقیقت پسندانہ سکیم قرار دیتے تھے۔ سرسید کے نظام کا تفصیلی ڈھانچہ درج ذیل ہے۔

ماڈرن سسٹم۔ جدید نظام

۱۔ ایڈمسٹریٹر۔ مینجر

۲۔ اساتذہ ۔ پیشہ ور ماہرین

اردو، عربی اور فارسی کالجز، جدید اور روایتی نظام

۱۔ درمیانے درجے کے عدالت اہلکار

۲۔ ادبیات پڑھانے والے

۳۔ مذہبی علما

عوامی نظام (نجی مسلم مدارس بشمول پرائمری اور ثانوی سکولز)

حافظِ مکتب (مدارس جہاں حفظِ قرآن کا انتظام تھا)

واضح رہے کہ ۱۸۹۰ء کی دہائی میں سرسید نے حافظ مکاتب کو یکسر مسترد کیا کیونکہ یہ تعلیم دور جدید میں قطعاً غیر ضروری تھی۔ سرسید کی ان نظری و فکری تبدیلیوں کی عملی جھلک علی گڑھ محمڈن اینگلو اورینٹل کے نصاب میں دیکھی جاسکتی ہے۔ انہوں نے یہاں پر انگریزی اردو اور فارسی و عربی کے شعبہ جات قائم کیے۔(۱۵)

کیا ہم سرسید پر اس سلسلے میں کوئی تنقید کر سکتے ہیں کہ انہوں نے مسلمانوں کو جدید تعلیم کی راہ پر کیوں ڈالا؟ انہوں نے انگریزی تعلیم کے فروغ کی کوشش کیوں کی؟ ہرگز نہیں۔ لیکن بطور عالم دین اور مفسر قرآن ان کے ذہن میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان کا اثر نہ صرف ان کے نظام تعلیم بلکہ نصاب تعلیم پر بھی ظاہر ہوا۔ یہ کچھ آگے چل کر ظاہر ہو گا کہ پاکستان میں علم کو مسلمان کرنے کی کوششوں (Islamination of Knowledge) کے محرک بھی سرسید ہی کے نظریات ہیں۔

قرآن کریم کو سائنسی علوم کا منبع و سرچشمہ ثابت کرنے کی کوشش اس سے قبل کرامت علی جونپوری بھی کر چکے تھے تاہم اس میں سب سے بڑا نام سرسید ہی کا ہے۔ سرسید کے ذہنی اتار چڑھاؤ کو مندرجہ ذیل انداز میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

i۔ وہ مذہب اسلام کے شیدائی تھے

ii۔ وہ مومن بھی تھے اور ساتھ ہی ساتھ فرد پرست بھی

iii۔ وہ سائنس کے بھی بے حد مداح تھے۔

iv۔ وہ مسلمان بھی تھے اور بیک وقت فطرت پرست (Hatmalifs) بھی۔

v۔ وہ قوم پرست بھی تھے اور انگریزوں کے وفادار اور دلدادہ بھی۔

vi۔ قوم پرست ہونے کے ناطے وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک قوم سمجھتے تھے لیکن ۱۸۶۷ کے اردو ہندی تنازعے کے بعد ان کی توجہ کا محور مسلمان بن گئے۔ اگرچہ انہوں نے ہندوؤں سے ہاتھ کھینچ لیا لیکن انگریزوں کی وفاداری سے دستبدار نہیں ہوئے۔

vii۔ اپنے مخصوص خدشات کی بنیاد پر انہوں نے مسلمانوں کو مرکزی دھارے کی سیاست سے دور رکھا انہیں انڈین نیشنل کانگرس سے بچنے کی ہدایت کی اور مسلم کانگریس / ایجوکیشنل کانگریس کے نام سے مسلمانوں کو ایک الگ غیر سیاسی یا نیم سیاسی پلیٹ فارم مہیا کیا۔

viii۔ ابتداً روایتی تعلیم کے علمبردار رہے لیکن انگستان کے دورے کے بعد اس سے رجوع کر لیا۔

ix۔ تعلیمی فروغ کا آغاز عوامی و مساویانہ تعلیم سے کیا لیکن برطانوی معاشرت اور نظام کو دیکھنے کے بعد طبقاتی نظام تعلیم کے قائل ہو گئے۔

اسی دور میں مسلمانوں کا ایک ممتاز ادارہ بالکل مختلف تعلیم دے رہا تھا۔ یہ کوئی اور نہیں بلکہ دارالعلوم دیوبند تھا۔ دارالعلوم دیوبند روایتی دینی تعلیم کا ادارہ ہونے کے ساتھ ساتھ انگریزوں کا نہایت شدت سے مخالف تھا۔ انگریزوں کی وفاداری کو رد کرتا۔ دیوبند ان کے خلاف جہاد پر آمادہ تھا۔ دارالعلوم کی بنیاد مولانا قاسم نانوتوی نے ۱۸۶۶ء میں رکھی تھی۔ ابتداً یہ ایک چھوٹا سا مدرسہ تھا جو ممبر سے ملحق تھا تاہم بعد ازاں اس نے ایک طاقتور تحریک آزادی کی صورت اختیار کر لی۔ دیوبند نے بلند پایہ اور جید علمائے دین پیدا کیے جن میں سے مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا حسین احمد مدنی اسیر مالٹا شیخ الاسلام مولانا محمود الحسن سے کون واقف نہیں۔

سرسید نے مذہب، فلسفے، سائنس، انگریزی اور علوم مغرب کے ملغوبے سے جو شے تخلیق کی وہ روایتی اسلام کے لیے قطعاً پسندیدہ اور قابل قبول نہ تھی۔ بیرونی مخالفت کو تو خیر چھوڑیے اس کے اجزائے ترکیبی ایک دوسرے سے بھی ہم آہنگ نہ تھے یہی وجہ تھی کہ اپنے تمام تر اخلاص اور نیک نیتی کے باوجود سرسید مرتد اور کافر جیسے دردناک اور افسوسناک خطابات سے نہ بچ سکے۔ سرسید نے بھی دیوبند کے خلاف پرزور لڑائی لڑی اور ان کے طلباء کو ''ملا'' اور اپنے فارغ التحصیل نوجوانوں کو ''مولانا'' قرار دیا۔ یاد رہے کہ دیوبند والے طنزاً علی گڑھ کے تعلیم یافتہ افراد کو مسٹر کہا کرتے تھے۔ یہ برصغیر کے مسلمانوں کا ایک اضافی المیہ تھا کہ تعلیم جیسے مثبت میدان

میں بھی خود کو تقسیم، تفرقے اور دھڑے بندی سے محفوظ نہ رکھ سکے۔ سر سید کے نظام تعلیم اور ہندوستان میں مسلمانوں کی دیگر تحریکوں میں مندرجہ ذیل فرق نمایاں تھے۔

i۔ دیگر حضرات بھی جدید مغربی علوم کی افادیت سے آگاہ تھے لیکن وہ ان کو قرآن میں مخل ہونے کی اجازت دینے پر ہرگز تیار نہ تھے۔ انکے برعکس سر سید نے قرآن کی تفسیر جدید لکھ کر اسے سائنس کا ماتحت بنا دیا۔ یہاں بھی ان کا نیک حصہ مسلمانوں کو ذہنی خلفشار سے بچانا تھا مگر یہ کوشش زیادہ بار آور نہ ہوئی۔

ii۔ سر سید نے سب سے پہلے سیکولر اور مذہب کے تضاد کو بہت زیادہ نمایاں کیا۔ دونوں میں خط تفریق کھینچا اور مذہب کو درجہ دوم کی حیثیت دے دی۔

iii۔ دیگر تحاریک ہندو مسلم اتحاد کی تہہ دل سے قائل تھیں لیکن انگریز کو دشمن گردانتے ہوئے ان سے کھلی جنگ کی ترغیب دیتی تھیں۔ تاہم سر سید دل و جان سے انگریزوں کے گرویدہ تھے اور ان کی اطاعت کو جزو ایمان قرار دیتے تھے۔

iv۔ سب سے افسوسناک پہلو یہ تھا کہ سر سید نے نہ صرف اپنے طلبا کی سیاسی تربیت کی بلکہ انہیں سیاست سے دور رہنے کی ترغیب دی۔ یہ سیاسی علوم ورثے میں پاکستان کو بھی منتقل ہوگئے کیونکہ پاکستان کے بنانے والے زیادہ تر انہی کے شاگرد تھے۔

v۔ ہندوؤں کو مسلمانوں کا حقیقی دشمن قرار دے کر انہوں نے ایک ناقابل تلافی اور سنگین غلطی کا ارتکاب کیا۔

مزید نکتۂ نظر سے پہلے کچھ نکات پر روشنی ڈالنا بے حد اہم ہے۔

i۔ سائنس اور مذہب کو خطہ وار کرنے کی کوشش کبھی سود مند ثابت نہیں ہوئی، بلکہ اس سے مزید نقصانات ہوئے اور ذہنی و فکری انتشار میں اضافہ ہوا۔

ii۔ اگرچہ سر سید نے سیکولر اور مذہبی تعلیم کو الگ الگ کر دیا لیکن ساتھ ہی ان کو باہم مدغم کرنے کے لیے بھی کوشاں رہے۔

iii۔ بائبل اور قرآن کو یکساں اور ہم آہنگ کرنے کی ان کی شدید آرزو بھی حیرت انگیز ہے۔ کیونکہ ایک طرف تو وہ ترقی کی خاطر قرآن کی بھی تفسیر جدید لکھتے ہیں تو دوسری طرف بائبل کے قدیم اور مشکوک متن کو بھی درست ثابت کرنے پر مصر ہیں۔

iv۔ انگریزوں کے لیے ان کی بے پایاں محبت اور مبالغہ آمیز وفاداری نے ان سے دوست اور دشمن میں تفریق کرنے کی اہلیت سلب کر لی۔ ہندوؤں کو مسلمانوں کا دشمن قرار دے کر انہوں نے سیاسی منظر نامے میں مسلمانوں کو بالکل تنہا کر دیا۔ انگریزوں کا دست نگر بننے کے بعد مسلمانوں کے پاس ان کے مفادات کا تحفظ کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ رہا۔ انگریز جیسا شاطر اس عمدہ موقعے کو ہاتھ سے کیوں جانے دیتا؟ ۱۹۰۹ء میں

منٹو۔ مارلے نے لوکل میونسپل کمیٹیوں میں جداگانہ طرزِ انتخاب پر مبنی فرقہ وارانہ انتخابات متعارف کروا دیے جن کے تحت ہندو صرف ہندوؤں کو اور مسلمان مسلمانوں کو ووٹ دے سکتے تھے۔ مسلمانوں کی آبادی کم ہونے کے باعث مسلمانوں کو کم ووٹ ملنا لازم تھا جس کا نہایت افسوسناک نتیجہ نکلا کہ سرزمین ہند پر قانونی و آئینی اداروں میں مسلمانوں کی نمائندگی آٹے میں نمک کے برابر رہ گئی۔[۱۶]

v۔ سر سید نے ایسے طلبا پیش کیے جو ہندوستانی قوم تو درکنار مسلمانوں کے مرکزی دھارے (Mainstream) سے بھی الگ تھے۔ یہ مخصوص گروپ ملکی سیاست سے بے بہرہ اور کثیر مسلم آبادی کے لیے اجنبی تھا۔ مسٹر زکا یہ مختصر سا گروپ انگریزوں کا شیدائی تھا اور ان کی وفاداری کا دم بھرتا تھا۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں سر سید نے مساویانہ تعلیم کو ترک کر کے طبقاتی نظام کی حمایت کو شعار بنالیا تھا جس کی ان کے پاس ٹھوس وجوہات تھیں۔ ان کے عملی نظام تعلیم میں تخلیق کاروں کی کوئی جگہ نہ تھی کیونکہ عملاً ایسا نظام تخلیق کار کو پیدا کر ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ تخلیقی صلاحیتیں اپنے فروغ و ارتقا کے لیے جس علمی آزادی کی طلبگار ہوتی ہیں وہ ایک کٹڑ اور شدت سے تقسیم شدہ طبقات والے معاشرے میں ممکن نہیں۔

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ پاکستان کا نظام تعلیم انہی خطوط پر استوار ہے۔ اور آج تک تعلیمی اداروں میں علمی و تحقیقی آزادی نہ ہونے سے ہم خواندہ طوطے تو بڑی تعداد میں پیدا کر رہے ہیں لیکن ان میں سکالر، مفکر، دانشور اور سائنس دان کتنے ہیں؟ ہم جانتے ہیں آج بھی پاکستان میں فلسفہ کا کوئی ایک جریدہ بھی شائع نہیں ہوتا۔ کیوں؟ اس لیے کہ سر سید سے ورثے میں لیے ہوئے نظام میں فلسفے کی کوئی جگہ ہے ہی نہیں۔

آج بھی ہمارے تعلیمی مسائل وہی ہیں جو انیسویں صدی کے ہند میں تھے۔ ان کی مختصر تفصیل درج ذیل ہے۔

I۔ مغربی تہذیب و ثقافت کا خوف

Ii۔ مذہب کو سائنس سے ملانے کی سر توڑ (مگر ناکام) کوششیں

Iii۔ روایتی طریقہ تعلیم کی بیخ کنی

Iv۔ جدید تعلیم کی جانب رغبت کمی

v۔ ذریعہ تعلیم کی بحث (انگریزی یا اردو)

vi۔ نصاب کا تعین

vii۔ ناخواندگی

اس سوال کے جوابات فلسفے کو دینے چاہئیں کیونکہ مسلم تعلیمی ڈھانچے کو یہ بنیاد سر سید احمد خان نے عطا کی تھی۔ انہوں ن احتماع صد پن بنانے کی کوشش کی مگر امت میں مزید فکری خلفا اندینی اذیت پیدا کی۔

اب آیئے پاکستان کی جانب یہ دیکھنے کے لیے کہ یہاں اس تعلیمی فلسفے نے کیا نتائج پیدا کیے ہیں۔ اپنی آزادی کے ۷۱ برس بعد بھی ہم ناخواندگی سے برسرِ پیکار ہیں۔ سیکولرازم اور مذہب کی تفریق پاکستان میں بے حد نمایاں ہیں۔ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں دونوں کے حامی پائے جاتے ہیں جن کا پورا پورا دن انہی موضوعات پر تبادلہ خیالات کرتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ دونون ایک دوسرے کو برداشت نہیں کر پاتے۔ آج بھی پاکستان میں زبان کا مسئلہ اپنے عروج پر ہے اور روایت اور جدیدیت ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں۔ ان سب سے الگ تھلگ انسانوں کا ایک انبوہ پایا جاتا ہے جو عوام کہلاتے ہیں اور آج بھی لاعلم، ان پڑھ، افسردہ، دل گرفتہ اور مایوس ہیں۔ انہیں مغربی استعمار سے بری طرح ڈرا دیا گیا ہے۔ وہ ہر سکول میں مغرب کے خطرے سے ہراساں ہیں۔ حالانکہ حقیقت اس سے برعکس ہے وہ مغربی استعمار سے نہیں اپنے لیڈروں سے خوفزدہ ہیں جو آج تک انہیں کوئی مذہب، قابل عمل، درست اور اعلیٰ نظام نہیں دے سکے اور دیں بھی کیسے کیونکہ وہ خود فکری تناقضات کا بری طرح شکار ہیں۔ سر سید چند معاملات کو سمجھنے میں ناکام رہے۔

i۔ سر سید کے دور میں بھی لوگ سائنسی علوم کی اہمیت سے واقف تھے اور کبھی بھی کسی عالم دین نے سائنسی علم کی تحصیل سے منع نہیں کیا تھا۔ جھگڑا علم کا نہیں بلکہ دو نظریات اور دو شناختوں کا تھا۔

ii۔ سر سید نے اپنی کتاب اسباب بغاوتِ ہند میں لکھا تھا کہ انگریزوں نے مقامی آبادی کی آرزوؤں اور امنگوں کو سمجھے بغیر اپنے قواعد وضوابط نافذ کیے۔ وہ ہندوستان کے عوام کی ثقافت، تمدن اور ماضی کے اداروں کی روح سے بے بہرہ رہے۔ لیکن علی گڑھ تحریک کے دوران سر سید خود مغربی علوم اور سائنس کی حمایت میں اتنا آگے نکل گئے کہ انہوں نے مسلمانوں کی امنگوں، آرزوؤں، تمدن، رسوم اور روایات کو فراموش کر دیا۔[۱۷]

iii۔ ایک بات جو زیر نظر تحریر میں بالخصوص نمایاں کی گئی ہے وہ یہ کہ مسلمانوں کے جدید علوم سے بے بہرہ رہنے کی دو وجوہات ہیں۔ پہلی تو یہ کہ انیسویں صدی کے مسلمان بے حد قدامت پسند اور مذہبی تھے جو اپنے بچوں کو دینی تعلیم کے علاوہ کسی اور علم سے آشنا کرنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ کچھ محققین کے نزدیک اقلیت ہونے کے تصور نے مسلمانوں کو نفسیاتی طور پر بری طرح متاثر کیا طاقت کے زوال نے عدم تحفظ کے احساس کو مزید بڑھا دیا ہے یہی وہ دو مقبول عام وجوہات ہیں جنہیں سر سید نے بھی بعینہٖ قبول کر لیا اور تیسری اور اہم سماجی وجہ کو نظر انداز کر دیا۔ ایک اہم اور قابل غور نکتہ یہ ہے کہ کوئی بھی گروہ تعلیم برائے تعلیم کا قائل نہیں ہوتا، بلکہ اس سے سماجی فوائد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ محض تعلیم تو اگر کسی کو مفت بھی فراہم کر دی جائے تو وہ اس کی اہمیت کو نظر انداز کر دے گا۔ ہندو جو ابتداً زیادہ خوشحال نہ تھے بڑی تیزی اور جوش وخروش کے ساتھ انگریزی تعلیم کی جانب راغب ہوئے اور سرکاری ملازمتوں پر چھا گئے لیکن مسلمان چونکہ انگریزوں کے کشتہ ستم تھے جنہوں نے انہیں اقتدار اور روزگار دونوں سے محروم کیا تھا اس لیے انگریزوں سے ناپسندیدگی اور ان کی پیش کردہ نوکریوں

کو مسترد کرنا مسلمانوں کے لیے ایک فطری عمل تھا۔ چنانچہ مسلمانوں نے اپنی بقا کے لیے تعلیم سے زیادہ زراعت اور تجارت کو فروغ دیا۔ مسلمان اب تک طبقہ امرا سے مفلس و محروم عوام میں شامل ہو چکے تھے۔ انگریزی تعلیم اور سرکاری نوکریوں کو ٹھکرانے کی وجہ سے مسلمانوں میں تعلیم یافتہ متوسط طبقہ (مڈل کلاس) پیدا ہی نہ ہو سکا۔ جس نے مستقبل کے سیاسی منظر نامے پر گہرے (منفی) اثرات مرتب کے۔

iv۔ سر سید اپنی قوم کی تساہل پسندی اور تعلیم دشمنی سے آگاہ تھے جسے بطور وحدت خود کو اوپر اٹھانے کا کوئی شوق نہ تھا۔ بدقسمتی سے سر سید نے ان دونوں بری عادات کے خلاف جنگ کرنے کی بجائے مسلمانوں کو میٹھی چوری کھلانے کا عادی بنا دیا۔ انہوں نے انگریز سرکار سے سرکاری ملازمتوں کے لیے کوٹہ منظور کروایا تا کہ علی گڑھ کے گریجوایٹ ان آسامیوں پر مقرر ہو سکیں۔ اس کوٹہ سسٹم کی ''برکات'' سے پاکستان آج تک نجات نہیں پا سکا۔ اسی کوٹہ سسٹم نے مسلمانوں کو ہندوؤں کے سامنے ہمیشہ کے لیے کمتر اور ہیچ بنا دیا کہ وہ مقابلے میں ان سے نہیں جیت سکتے۔ محنت سے جی چرانے والے مسلمانوں میں کوٹا سسٹم نے دلجمعی کی رہی سہی عادت کو بھی خاک میں ملا دیا۔ آیئے اب آج کے پاکستان میں کوٹا کے فیوض کا کچھ تذکرہ کریں۔

ا۔ بدعنوانی، جس کے لیے پاکستان میں لفظ کرپشن بے حد مقبول ہے کوٹے ہی کی پیداوار تھے۔ مخصوص کوٹا پر جب میرٹ کو ترک کر کے جنس، علاقے اور معذوری وغیرہ کی بنیاد پر نوکریاں دی جاتی ہیں تو ایسے میں کمتر اہلیت کے نالائق لوگ اوپر آتے ہیں۔

ب۔ کوٹا کی بنیاد پر جب اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد نچلے درجے کی نوکریاں قبول کرنے پر مجبور ہوتے ہیں تو دیگر افراد میں مایوسی پھیلتی ہے اور وہ تعلیم کو بے مقصد اور ناکارہ شے سمجھتے ہوئے دکانداری، ہاتھ کے کاموں اور دیگر ایسے پیشوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں یہ فقرہ بے حد عام ہے۔ "تعلیم کا کیا فائدہ ہے؟ نوکری تو ملتی نہیں"۔

ج۔ اب ذرا نکتہ 'ا' کی طرف لوٹیے، کرپشن اور سفارش کا کوٹا سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جہاں بھی بھرتیوں کا معیار میرٹ کے علاوہ کچھ اور ہو گا، وہاں غیر اخلاقی اور غیر قانونی ذرائع لازماً فروغ پائیں گے۔

د۔ کوٹا فی الحقیقت محروم طبقات کے لیے ہوتا ہے جو مراعات یافتہ طبقے کی نسبت ذرائع تک رسائی نہ رکھتے ہوں لیکن عملاً کیا ہوتا ہے؟ ان محروموں کے نام پر بھی صاحب حیثیت ہی پھلتے پھولتے ہیں۔ پاکستان جیسے ملک میں جہاں ابھی تک جمہوری ادارے مستحکم تو کیا صحیح معنوں میں قائم بھی نہیں ہو سکے وہاں کوٹے کی نشستیں پیروں، گدی نشینوں، وڈیروں، جاگیرداروں اور سیاستدانوں کے ووٹ بینک کو محفوظ رکھنے کے کام آتی ہیں۔ ووٹ کے عوض نوکری سے جہاں کسی حقدار کو اس کا حق نہیں ملتا وہاں ملک سفارشی اور نااہل لوگوں کے ہاتھوں پسماندگی کی دلدل میں دھنس گیا ہے۔

ر۔ جب اہل افراد خود کو اس طرح محروم پاتے ہیں۔ تو ان کے لیے ملک چھوڑنا اور ترک سکونت ہی واحد پناہ گاہ قرار پاتی ہے۔ ملک سے ذہین افراد کا انخلا Brain Drain اسی سفارش اور کوٹے کا شاخسانا ہے۔

س۔ نااہل افراد اعلیٰ ملازمتوں پر فائز ہو کر بھی اپنی روش نہیں بدلتے، ان کا مقصد بدستور پیسہ کمانا، دونوں ہاتھوں سے ملک کو لوٹنا اور اپنے ہی جیسے افراد کے ہاتھ مضبوط کرنا ہوتا ہے۔

ش۔ سر سید کی حمایت یافتہ اشرافیہ قوم پرستی کا ایک اور افسوسناک نتیجہ یہ نکلا کہ اختیارات اور طاقت کو ایک مرتبہ (کوٹا کی بنیاد) حاصل کرنے والے پھر اس سے دستبردار ہونے سے قطعاً انکاری ہو گئے۔ طاقت، سرمایہ اور اقتدار ان کے منہ کو نشے کی طرح لگ گئے انہیں قانونی، اخلاقی اور جائز ذرائع سے ہٹانا ممکن نہ رہا۔ ظاہر ہے کہ کمزور انسان تو یہ کام کر ہی نہیں سکتا۔ سو یہ کیا بھی تو کس نے؟ انہی جیسے دیگر افراد نے، گویا بدعنوانی کے اس دائرے کو توڑنا قابل اور باصلاحیت افراد کے لیے ممکن ہی نہ رہا۔ اس طرح اختیارات حاصل کرنے والی افسر شاہی (بیوروکریسی) نے جمہوری اداروں کو زیر نگیں بنا کر رکھا۔ عوام کے منتخب نمائندوں کی تضحیک کو اپنا فرض گردانا، پارلیمنٹ کا مذاق اڑایا اور آزادی کے اثرات جمہور تک پہنچنے ہی نہ دیے۔ تعلیم اور صحت کو کبھی اپنا نصب العین نہ سمجھا بلکہ عوام میں اس خیال کو راسخ کیا کہ تعلیم ایک بے مقصد اور بے معنی چیز ہے۔

ص۔ سر سید ہندوسان میں مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں مایوسی اور قنوطیت کا شکار رہے۔ معاشرتی و تعلیمی اصطلاحات کے لیے بھی ان کا آئیڈیل انگریز ہی رہے اور وہ مسلمانوں کی اہلیت سے متعلق ہمیشہ احساس کمتری کا شکار رہے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کو سیاسی سرگرمیوں اور ہندوؤں سے دور رہنے کا مشورہ دیا۔ اس سے مسلمان مرکزی دھارے (main streem) سے کٹ گئے اور سیاسی بصیرت سے محروم رہے۔ سر سید نے مسلمانوں کو انگریزوں کی وفاداری کا درس دیا اور ان کا رویہ ہندوؤں کے برعکس انگریزوں کے سامنے ہمیشہ معذرت خواہانہ اور خادمانہ رہا۔

ض۔ ان کا نظام تعلیم جو طبقاتی ڈھانچے پر مشتمل تھا(ہے) دراصل ان کے اپنے طبقہ اشرافیہ کو فائدہ پہنچانے کے لیے تھا۔

اختتامیہ:

زیرِ نظر مضمون کا عنوان ''سر سید احمد خاں کا تعلیمی نظام۔ ایک تنقیدی جائزہ'' اسی سوچ کے پیش نظر تجویز کیا گیا کہ اس میں جنوبی ایشیائی مسلمانوں کے محسن کی کاوشوں کا ایک متوازن جائزہ لیا جا سکے۔ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے سر سید کی خدمات کسی رسمی تعارف کی محتاج نہیں اور ان کا مقام و مرتبہ ہر شے سے بالاتر ہے۔ سر سید نے جہاں مسلمانانِ ہند کی تعلیم و تربیت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی، وہیں ان کے پیدا کردہ نظام کی

خامیاں اور کوتاہیاں مسلمانوں کے لیے نہایت ضرر رساں بھی ثابت ہوئیں۔ اس تحقیق کا مقصد ہرگز ان کے رتبے اور خدمات کا انکار نہیں بلکہ ان کی مساعی کا غیر جانبدارانہ اور معروضی جائزہ لینا تھا تاکہ ان تعلیمی مسائل کی نشاندہی ممکن ہو سکے جو ان کے تعلیمی نظام سے مسلمانوں (پاکستان) کو ورثے میں ملے اور آج تک پاکستان کے جمہوری و فلاحی ریاست بننے کی راہ میں حائل ہیں۔

یہ امر افسوس اور تعجب سے خالی نہیں کہ سرسید کے پورے نظام تعلیم میں بچیوں، لڑکیوں اور خواتین کی تعلیم کا رسمی تذکرہ بھی نہیں۔ سرسید کے لیے تعلیم صرف مرد کی تعلیم ہے اور اپنے ہم عصر مسلمان رہنماؤں، مثال کے طور پر اکبر الہ آبادی کی طرح، ان کا رویہ بھی عورتوں کے لیے متعصبانہ ہے۔ مسلمانوں کی ایک المناک ترین بدنصیبی یہ بھی رہی کہ بشمول شاعر مشرق محمد اقبال، ان کے رہنما عورت کی تعلیم کو خاندانی و سماجی بگاڑ کا باعث سمجھتے تھے۔ اکبر تو اس حد تک جا پہنچے کہ پڑھی لکھی لڑکیاں اپنی بارات میں ناچنے لگیں گی اور اقبال کے نزدیک علم عورت کو ''نازن'' بنا دینا ہے۔ قصہ کوتاہ کہ سرسید سمیت ہندوستان کے مسلمان رہنماؤں نے اپنے نظریات ایسے غیر حقیقی اور نقصان دہ مفروضوں پر کھڑے کیے کہ وہ مسلمانوں میں مزید جہالت، پسماندگی اور فرسودگی پر منتج ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ۲۰۲۲ میں بھی مسلمان تعلیمی اعتبار سے جنوبی ایشیا کے پسماندہ ترین افراد ہیں۔ مسلمان خواتین ان پڑھ اور ناخواندہ انسانوں کا سب سے بڑا گروہ ہیں۔ پاکستان کے تعلیمی اشارے سارک ممالک میں نچلی ترین سطح پر ہیں۔

سرسید بنیادی طور پر مسلمانوں کو عموماً اور اپنے طبقے کو خصوصاً اقتصادی بدحالی سے نکالنا چاہتے تھے لہٰذا ان کے تعلیمی نظام کا مقصود اور منتہا صرف سرکاری نوکریوں کا حصول تھا۔ وہ علمیت اور تخلیقی اہلیت کے شاید قائل نہ تھے اور اگر ہوتے بھی تو ان کے نظام تعلیم میں اس کی گنجائش نہ تھی۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (حالیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) ایسے کمتر اہلیت کے حامل مسلمانوں کی جائے پناہ تھا جو میرٹ پر اپنے علاقے کے کسی نامور ادارے میں داخلہ حاصل نہ کر سکتے تھے۔

علی گڑھ کالج کے قیام نے بڑی تعداد میں مسلمان گریجوایٹ تو پیدا کر دیے۔ جو کوٹا سسٹم پر نوکریاں حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے لیکن ساتھ ہی وہ محنت اور لگن سے یکسر بیگانہ ایسے لوگ تھے جنہیں علم تھا کہ بغیر پڑھے بھی وہ علی گڑھ کالج میں داخل ہو جائیں گے اور مقابلے کے بغیر انہیں مسلمانوں کے کوٹے پر نوکری مل جائے گی۔ صرف مسلمانوں کے لیے تعلیمی ادارہ قائم کر کے انہوں نے یہ تاثر بھی دیا کہ مسلمان ہندوستان کے دیگر عوام سے الگ، مختلف اور جدا ہیں اور جو اپنے ساتھ کسی دوسرے کو قبول نہیں کرتے۔

قیام پاکستان کے بعد فوری طور پر یہاں آنے والوں میں علی گڑھ کے فارغ التحصیل بڑی تعداد میں شامل تھے۔ جنہوں نے نوزائیدہ مملکت میں کاروبار حکومت سنبھالا تو وہی فکری و عملی پالیسیاں ورثے میں لائے جو انہوں نے

علی گڑھ میں تحصیل کی تھیں۔ ریاست پاکستان میں اول تو تعلیم کو خاطر خواہ پذیرائی آج تک مل ہی نہ سکی اور جو تعلیم کے نام پر ہوا اس کا مقصد تخلیق کار، عالم، محقق اور سائنس دان پیدا کرنا ہرگز نہ تھا بلکہ امور مملکت کو چلانے کے لیے کلرکوں کی کھیپ پیدا کرنا تھا جو حکم حاکم پر سر تسلیم خم کریں، مسودے ٹائپ کریں، نوٹیفیکیشن نکالیں اور سوچنے سمجھنے کی ہر صلاحیت سے عاری ہوں۔ ایسا کیوں ہوا؟ ہمارے تعلیم یافتہ افراد طاقت کے سامنے ہمیشہ پسپا کیوں ہوئے؟ وہ تنقیدی سوچ اور خود مختاری سے کیوں بری طرح محروم رہے؟ کیوں انہوں نے اختلاف اور احتجاج سے ہمیشہ گریز کیا؟ اس کا جواب اس قدر سیدھا ہے کہ شاید پڑھنے والا یقین نہ کرسکے۔ سرسید کے نظام تعلیم نے آقا کی غلامی کو اپنے شاگردوں کے ایمان کا حصہ بنا رکھا تھا۔ انہوں نے اپنے طالبعلموں کو بغاوت، سوال اور اصولی موقف پر ڈٹنے سے ہمیشہ منع کیا تھا۔ ان کے ادارے کا بنیادی مقصد انگریزوں کے وفا دار سرکاری ملازم پیدا کرنا تھا جن کے لیے زندگی صرف روٹی اور اطاعت کے علاوہ کچھ بھی نہ تھی۔

عام مسلمانوں کو ہندوؤں سے دور رہنے کی تلقین کے باوجود سرسید نے اپنے ہم پلہ اور اشراف ہندوؤں سے ہمیشہ دوستانہ مراسم رکھے اور ان سے عطیات کی وصولی بھی جاری رکھی۔ انیسویں صدی کے ہندوستان کے مسلمانوں کی جنگ فی الاصل دو شناختوں، دو نظریات اور مختلف بیانیوں کی جنگ تھی۔ سرسید نے نیک نیتی اور اچھے دل سے ان کو ملانے اور ان میں مفاہمت پیدا کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ کوشش نہ صرف بری طرح ناکام ہوئی بلکہ اس نے نظریاتی انتشار اور فکری خلفشار میں مزید کئی گنا اضافہ کیا اپنے جوش و خروش میں سرسید اس قدر آگے بڑھ گئے کہ خود مسلمانوں کے اندر ان کے خلاف شدید رد عمل پیدا ہو گیا اور وہ "نیچری" کہلانے لگے جو کم و بیش دہریے اور لادین کا متبادل ہے۔

قرآن اور نیوٹن کا نکاح پڑھوانا ان کے لیے اور مسلمانوں کے لیے یکساں طور پر تباہ کن ثابت ہوا اور طبقات، فرقوں، سیاسی ناداریوں اور بھانت بھانت کے دیگر تفرقات میں بٹے ہوئے مسلمان، مزید تقسیم اور کج فہمی کا شکار ہو گئے۔ سرسید نے سائنسی ولولے میں عامۃ المسلمین کے عقاید کو یکسر نظر انداز کر دیا۔

سرسید کے پیدا کردہ بیوروکریٹس انہی کی طرح عوامی امنگوں اور خواہشات، عقائد اور رسوم و رواج سے نہ صرف ناواقف تھے بلکہ انگریزوں کے پروردہ ہونے کی وجہ سے انہیں سے نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ لاکھوں مردوزن کے جان و مال و آبرو کی ہولناک قربانیوں سے بننے والا پاکستان اپنے عوام اور شہریوں کی آرزوؤں کی تکمیل کا نخلستان نہ بن سکا بلکہ سول بیوروکریسی ایک انسان دشمن اور مردم آزاد ادارہ بن کر سامنے آئی جہاں آج بھی پاکستان کا شہری "صاحب" کارخانہ زادے اور اس کے دفتروں میں دھکے کھا کھا کر زندگی کا خاتمہ کر لیتا ہے۔

علی گڑھ کا اشرافیہ ماحول، جمہوریت سے ایک خاص قسم کی عدوات اور مخاصمت رکھتا تھا۔ یوں بھی مسلمانوں کو متحدہ ہندوستان میں یہی کہہ کر جمہوریت سے متنفر اور خوفزدہ رکھا گیا تھا کہ اکثریت کی حکومت ہونے کے باعث یہ مسلمانوں کو نگل جائے گی۔ سرسید کے طلباء یہی ذہنی افتاد (Mindset) لے کر پاکستان آئے اور انہوں نے جمہوریت کے فروغ اور اس کے پنپنے کی راہ میں ہر ممکن رکاوٹ حائل کی۔ تاریخ کے اوراق کو یہاں دہرانے سے سوائے دل شکنی کے اور کچھ حاصل نہ ہو گا یوں بھی شمارے میں جگہ کی قلت اس بار کو اٹھانے کی متحمل نہ ہو گی۔ اکثریت کے خوف نے کبھی مشرقی پاکستان کے شہریوں کو اپنے جائز حقوق نہ ملنے دیے۔ امور مملکت میں اپنا جائز حصہ نہ ملنے دیا۔ سول بیوروکریسی کے متکبرانہ رویے اور توہین و تمسخر جس نے ان میں شدید احساس محرومی اجاگر کیا۔ سول بیوروکریسی میں ایک مخصوص علاقے کی بالادستی سے روز اول ہی سے پاکستان میں علاقائی، لسانی اور صوبائی تعصب جیسی برائیاں جڑ پکڑنے لگیں۔ ان کا انجام اب تاریخ ہے جو اس مضمون کے دائرہ کار (Scape) سے باہر ہے۔

شاید قاری کو یہ سب کچھ پڑھ کر صدمہ پہنچا ہو اور وہ مصنف سے جائز طور پر ناراض ہو کہ کیا یہ احساس ناشناسی کی ایک مثال نہیں کہ کسی محسنِ ملت کی نیکیاں فراموش کر کے اسے اپنی ناکامیوں کا تنہا ذمہ دار ٹھہرایا جائے۔ اعتراض بالکل جائز ہے برصغیر کے مسلمان شاید سرسید کا قرض کبھی ادا نہ کر سکیں۔

پاکستان میں تعلیم سمیت ہر شعبے میں ناکامی کے ذمہ دار لاتعداد افراد ہیں جن کا تذکرہ کرنے کے لیے قاموس (Encycle pedias) درکار ہو گا۔ سرسید ہماری فکر و نظر کی کوتاہی اور ژولیدگی کے اکیلے ذمہ دار ہر گز نہیں، بلکہ قیام پاکستان کے بعد ملک کو چلانے کے لیے جو برے بھلے تعلیم یافتہ افراد میسر آئے وہ انہی کی عطا تھے، اگر وہ بھی نہ ہوتے تو نجانے آج ہمارا کیا حشر ہوتا۔ لیکن اگر دوررس نتائج پر نگاہ ڈالیے تو وہ نظامِ فکر اور ذریعہ تعلیم جو سرسید احمد خان رحمت اللہ علیہ کا عطا کردہ اور ورثہ ہے۔ ہماری متعدد سماجی، سیاسی، معاشی، ذہنی، عملی اور ادارہ جاتی ناکامیوں کا باعث ہے۔ ہماری یونیورسٹیاں تعلیمی اداروں سے زیادہ میدان جنگ کا نقشہ پیش کرتی رہی ہیں بلکہ اب بھی کر رہی ہیں۔ عدم برداشت اور سنجیدہ بحث و مکالمہ ان سے کوسوں دور ہیں۔ پاکستان کی جامعات میں ہونے والے قتلوں کی تعداد غالباً دنیا بھر میں کسی بھی ملک سے میل نہیں کھاتے۔ یقیناً سرسید نے کبھی بھی اپنے طلبا کو قتل و غارت کی تعلیم نہ دی تھی لیکن جو نظریاتی و سماجی یک رنگی ان کے کالج کے ثقافتی ماحول کا حصہ تھی اس میں کسی دوسرے نکتہ نظر کی کوئی گنجائش ہر گز نہیں تھی۔ ایسا ماحول تنوع اور نقطہ و نظر کے لیے زہر قاتل ہوتا ہے۔ اور یہاں سے اُگنے والے بیج آمریت، تعصب، عدم رواداری، تنگ نظری اور بند دماغوں جیسے ثمر ہی پیدا کر سکتے ہیں۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ سی لائیڈ تھورپ، قبل از تقسیم ہندوستان میں تعلیم اور مسلم قوم پرستی کا فروغ، مطبوعہ (کراچی۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، ۱۹۶۵ء)صفحہ نمبر ۱۲

۲۔ لی کے بومین۔ لہرام، ہندوستان میں تعلیمی تنازعات، بمبئی(بمبئی) بی ڈی تراپوڑے والا سنز اینڈ کمپنی، ۱۹۴۳، صفحہ نمبر ۳۰

۳۔ سی لائیڈ تھورپ، صفحہ نمبر ۱۶-۱۷

۴۔ ایس این مکھرجی، ہندوستان کی تاریخ تعلیم (عہد جدید)، (بڑودا۔ اچاریہ بک ڈپو، ۱۹۵۷ء)صفحہ نمبر ۵۲

۵۔ محمد نعمان، مسلم ہندوستان۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام اور ارتقاء(الہ آباد۔ کتابستان، ۱۹۴۲)صفحہ ۱۷-۱۸

۶۔ ولیم ولسن ہنٹر، ''ہندوستان کے مسلمان''(لندن۔ ٹربرنر پبلشرز، ۱۸۷۱ء)صفحہ نمبر ۱۶۰

۷۔ ایضاً صفحات ۱۵۹-۱۷۱

۸۔ مانس کوہن، تصور قومی پرستی، (نیویارک۔ برلس، ۱۹۴۴)

۹۔ سرسید احمد خاں، ہندوستان کے معزز خاندان، اخبار سائنٹفک سوسائٹی، ۷ اپریل ۱۸۷۶ء

۱۰۔ ایضاً، ۵ مئی ۱۸۷۶ء

۱۱۔ سرسید احمد خان، مصروفیات، (لندن، معیار شیخ محمد اسماعیل، لاہور، مجلس ترقی ادب،)صفحہ نمبر ۱۸۷

۱۲۔ حفیظ ملک، سر سید احمد خان اور ہندوستان اور پاکستان میں مسلمانوں کی جدید کاری، (نیویارک کولمبیا یونیورسٹی پریس، ۱۹۸۰ء)صفحہ نمبر ۱۸۸

۱۳۔ ایضاً، ص صفحہ ۱۹۲

۱۴۔ ایضا، صفحہ ۱۹

۱۵۔ فریڈ اے نظامی، میجر جنرل (ر) غلام عمر، مظہر علی خان عارف مدیران سر سید اور علی گڑھ تحریک پر غوروخوض، (کراچی، فضل سنز پرائیویٹ لمیٹڈ، ۱۹۹۸ء)صفحہ ۴۸-۴۹

۱۶۔ عبد الولی خاں، حقائق، حقائق میں: تقسیم ہند کی ناگفتہ کہانی، مترجم ڈاکٹر سیدہ سید بن حمیدہ، (نئی دہلی۔ وکاش پبلشنگ ہاؤس، پی وی ٹی لمیٹڈ، ۱۹۸۷ء)صفحہ ۴

۱۷۔ سرسید احمد خان، اسبابِ بغاوت ہند، صفحہ ۴۲